ریحان احمد یوسفی

انسان کا مسئلہ

تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں مادی کامیابیوں کو مقصود بنانے کے بعد انسان کا سفر اسے دو ہی منزلوں تک پہنچاتا رہا ہے۔ ایک غفلت اور دوسری اضطراب۔ دنیا کے حسن و جمال اور اس کی مادی رونقوں نے جب کبھی انسان کے لیے اپنا دامن کشادہ کیا، اس نے خواہش کی رنگین بستی میں اپنے لیے غفلت و مستی کے عالیشان گھروندے ہی تعمیر کیے ہیں۔ وہ گھروندے جن کی کھڑکیوں سے موت کے اُس پار موجود دنیا کا کوئی منظر دکھائی دیتا اور نہ کسی دریچے سے آسمانی وحی کے روشن سورج کی کوئی کرن ہی اندر داخل ہو پاتی ہے۔

دوسری طرف جن لوگوں کی خواہشات کے گھروندے حالات کی بے رحم موجوں کے ہاتھوں برباد ہو جاتے یا جن کی حساس طبعیت مادیت کے غبار میں اٹ کر اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتی اور اندھی خواہش کے بجاے بینا عقل کی نگاہوں سے زندگی کو دیکھنا چاہتی ہے، وہ ہمیشہ جذباتی بحران، روحانی اضطراب اور عقلی عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس صورتحال کا تدارک ترک دنیا سے کرنا چاہا، مگر یہ مچھلی کو سمندری شکاریوں سے بچانے کے لیے خشکی پر لا ڈالنے کا نام ہے۔ یہ حل نہیں ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔

انسانوں کے خالق کی نظر سے اس کی غفلت پوشیدہ ہے اور نہ اس کا اضطراب۔ چنانچہ اس نے ہر دور میں انسانوں کو غفلت سے جھنجوڑنے کے لیے اپنے رسولوں کو انذار کا حکم دیا۔ انہیں قیامت کی پیشی سے خبردار کیا، خدا سے ملاقات کی یاددہانی کرائی، اس کی جنت کی خوشخبری دی اور اس کے عذاب کی پکڑ کی تنبیہ کی۔

یہ تنبیہ انسان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے اس کی روح میں ایک اضطراب پیدا کرتی ہے۔ یہ اضطراب بظاہر سکون کو ختم کرتا ہے، مگر نتیجے کے اعتبار سے یہ اِس دنیا کے ہر غم، دکھ اور درد سے پیدا ہونے والے اضطراب کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ غمِ بندگی انسان کو خدا پرستی کے جس راستے پر ڈالتا ہے، اس کا ہر قدم انسان کو ختم نہ ہونے والے اطمینان سے روشناس کراتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہی راہِ بندگی جذبات میں اعتدال، عقل کے اطمینان اور روح کے سکون کی ضامن ہے۔

آج کے دور میں جب انسانوں کی غفلت اور اس کی بے سکونی دونوں اپنے منتہائے کمال پر پہنچ چکے ہیں، روز قیامت خدا کے حضور پیشی سے خبردار کرنا اور اس دنیا میں خدا پرستی اور بندگی کی راہ پر چلنے کی دعوت دینا سب سے بڑا کام بن چکا ہے۔ آج غافلوں میں اضطراب پیدا کرنا اور کرب و اضطراب کے شکار لوگوں کے دلوں کو سکون و اطمینان سے بھرنا سب سے بڑی انسانی خدمت ہے۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی دریافت ہے اور اس دریافت کو دوسروں تک پہنچانا میرے لیے اب سب سے بڑا کام ہے۔

پیش نظر تحریر میں اس عظیم کام کے دوسرے جز پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ یعنی بندگی اور خدا پرستی کی دعوت کس طرح انسان کے جذباتی، عقلی اور روحانی کرب کو سکون میں بدل سکتی ہے۔ بندگی کس طرح دین اسلام کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، یہ اس تحریر میں میرا موضوع نہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنی کتاب ''میزان'' میں 'دین حق' کے عنوان سے اس موضوع پر تفصیلی کلام کر کے یہ بتایا ہے کہ بندگی کس طرح اپنا سفر طے کرتی ہوئی تزکیہ و احسان کی اس منزل تک جا پہنچتی ہے جو دین کا مطلوب ہے۔ اس تحریر میں میرے پیش نظر اسلام کی دعوت بندگی کے اُس پہلو کو سامنے لانا ہے جسے اختیار کرنے میں فرد و اجتماع کی زندگی کا اطمینان پنہاں ہے۔ بندگی کی دعوت، اللہ کے بندوں کو اللہ کے قدموں میں لا ڈالنے کا نام ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر دو جہاں کا سکون پوشیدہ ہے۔ یہی ہر نبی اور ہر رسول کی دعوت رہی ہے۔ اگلے صفحات میں اسی دعوت کو دور جدید کے پس منظر میں اور دور قدیم کی غلط تعبیرات سے بچتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میری یہ تحریر دین کے مقاصد اور اس کی تعلیمات کے مطابق رہے۔ یہ کوشش اگر کامیاب رہی ہے تو اس کی وجہ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کا فیضِ تربیت ہے۔ یہ اُنھی کے علم کا فیضان ہے کہ میں دین کے جز و کل، اصل و فرع، اصول و مقاصد اور احکام و علل کو دین کے اصل ماخذ یعنی قرآن و سنت کے مطابق سمجھنے کے قابل ہوا ہوں۔ اس لیے میں اپنی یہ تحریر استاذ گرامی کے نام معنون کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ اس کام کو اپنی بارگاہ میں قبولیت عطا فرمائے۔

سکون: انسان کا اصل مطلوب

انسان ہر دور میں جس چیز کو سب سے بڑھ کر تلاش کرتا رہا ہے وہ سکون و اطمینان کی دولت ہے۔ صدیوں سے انسان لذت و راحت، مال و دولت، طاقت و اقتدار، جاہ و حشم جیسے مادی اور مذہب و روحانیت، عبادت و ریاضت،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاق و خدمت جیسے غیر مادی راستوں سے جس منزل پر پہنچنے کی سعی کرتا رہا ہے وہ یہی سکون و اطمینانِ قلب کی منزل ہے۔

کچھ لوگ سکون و اطمینان کی اس حیثیت کا حقیقی شعور نہیں رکھتے۔ وہ عام طور پر اسے ایام فراغت کا ایک نتیجہ اور ہنگام زندگی کے تناؤ سے نجات کا ایک ثمرہ سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ انسانی شخصیت کے اندرونی تقاضوں کو ان کا مکمل جواب ملنے کا عمل ہے۔ یہی پوری انسانی سعی و کاوش کا مقصود ہوتا ہے۔ اس بات کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں۔ اپنے ہر عمل کے بارے میں اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ یہ میں کیوں کرتا یا کرتی ہوں؟ جو جواب ملے اس کے بارے میں پھر یہی سوال کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں واضح ہو جائے گا کہ ہمارے ہر کام کے پیچھے آخری مطلوب سکون کا حصول یا حاصل اطمینان کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔

انسانیت کے تمام مادی، اخلاقی، عقلی اور روحانی اعمال اور رویوں کا آخری مقصود اطمینان وسکون کا حصول اور اس کو ختم کر دینے والی چیزوں سے بچنا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کریم نے جب جنت کی کامیابی کو بیان کرنا چاہا تو اس کے لیے وہ تعبیر اختیار کی جو اطمینان کا سب سے مکمل بیان ہے یعنی 'لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون'۔ اس آیت کا درست ترین ترجمہ وہی ہے جو فکر فراہی کے اہل علم کرتے ہیں کہ 'جنت میں مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا'۔ خوف کا تعلق مستقبل میں پیش آنے والے کسی مسئلے اور حزن کا تعلق ماضی کے کسی حادثے سے ہوتا ہے۔ یہی دو چیزیں مل کر انسانی سکون کو غارت کر دیتی ہیں۔ خدا کے بندے جنت میں اس چیز سے محفوظ ہوں گے اور اسی لیے جنت میں داخلے کے وقت انھیں 'نفس مطمئنۃ' کہہ کر بلایا جائے گا۔ اور اس تحریر میں ہم یہ بتائیں گے کہ دنیا میں بھی جس قدر سکون ممکن ہے، وہ خدائے واحد کی بندگی کے راہ میں پوشیدہ ہے۔

عام طور پر لوگ خوشی و مسرت کو وہ حیثیت دیتے ہیں جو انسانی زندگی میں سکون و اطمینان کو حاصل ہے، لیکن یہ بات ٹھیک نہیں۔ خوشی ایک وقتی کیفیت کا نام ہے جو عام طور پر مادی مقاصد میں کامیابی کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سکون کے مستقل احساس کا بدل نہیں بن سکتی۔ جو لوگ خوشی کی تلاش کرتے ہیں دراصل ان کا مقصود بھی سکون ہوتا ہے کیونکہ خوشی دراصل سکون ہی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان خوشی کی تمنا اس لیے کرتا ہے کہ یہ آخر کار سکون کو جنم دیتی ہے۔ سکون خوشی کے مقابلے میں ایک برتر چیز ہے جو انسان کے اندر سے پھوٹتا اور مستقل طور پر انسانی شخصیت کا احاطہ کیے رہتا ہے۔ یہ احساس مادی ذرائع اور کامیابی کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ غیر مادی ذرائع سے بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حاصل ہو جاتا ہے۔

آج کے انسان کا المیہ

دور جدید کا انسان اس اعتبار سے بڑا بدقسمت ہے کہ تمام تر سائنسی اور سماجی ترقیوں کے باوجود وہ زمانۂ قدیم کے انسان کے مقابلے میں سکون سے زیادہ محروم ہے۔ قدیم زمانے کا انسان دور جدید کی سہولیات سے محروم تھا، اس کی آزادی؛ جاگیرداری، غلامی اور آمریت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی، مگر اس کے باوجود اس کا ذہن آج کے انسان کی طرح بے سکونی اور اس کی روح ایک اضطرابِ مسلسل کا شکار نہ تھی۔ یہ زمانہ جو پری موڈرن ازم (Pre Modernism) کہلاتا ہے، عقیدے کی بنیاد پر استوار تھا اور یہی عقیدہ بڑی حد تک انسانی سکون کا ضامن تھا۔

موڈرن ازم (Modernism) کے آغاز پر جب علوم کا ارتقا ہوا تو عقیدے کی جگہ عقل کو افکار انسانی میں بنیادی مقام حاصل ہو گیا۔ اس دور میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ مروجہ عقیدہ اور اس کے بہت سے عملی پہلو دور جدید کے عقلی سوالات کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ یوں مشرکانہ اور متصوفانہ مذاہب کی عقلی کمزوری تو واضح ہو گئی، مگر جدید عقلی علوم خود بھی ان سوالات کے واضح جواب نہ دے سکے جن کے برے بھلے جواب مروجہ مذاہب بہرحال پیش کیا کرتے تھے۔ تاہم اس دور میں علوم کے ارتقا نے انسانی زندگی کو اجتماعی طور پر بہت بہتر کر دیا اور فرد کے لیے بھی بڑی آسانیاں اور سہولیات میسر کر دیں۔ لیکن انسانی زندگی میں یہ بہتری اس کے قلب کو سکون نہ دے سکی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ انسان بظاہر ایک مادی وجود ہونے کے باجود اپنی اساس میں ایک نفسی یا روحانی وجود ہے اور محض مادی بنیادوں پر اس کے مکمل اطمینان کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس بات کی تفصیل ہم آگے کریں گے، لیکن سر دست یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ سائنسی ترقیاں جن کا مرکز و محور انسان کا مادی وجود تھا، اس کے نفسی یا روحانی وجود کی تسکین کا کوئی اہتمام نہ کر سکیں بلکہ الٹا مشرکانہ عقیدے کی بے اعتباری واضح کر کے، اس برے بھلے انتظام سے انسانوں کو محروم کرنے کا سبب بن گئیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مادی وجود کی تسکین کو جب مقصود بنا لیا جائے تو اس کے نتیجے میں خیر و شر سے بے نیاز انسان اور اخلاقی اقدار کو پامال کرنے والے شیطان جنم لیتے ہیں۔ یہ دونوں طرح کے لوگ کچھ ہی عرصے میں زمین کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔ یہی کچھ انسانیت کے ساتھ اس وقت ہوا جب بیسویں صدی کے نصف اول میں موڈرن ازم اپنے عروج پر تھا۔ ایسے وقت میں دو عظیم جنگوں میں کروڑوں افراد کی ہلاکت کا سانحہ پیش آ گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب تیسری جنگ عظیم ہر لمحہ متوقع تھی اور خوفِ فنا کے تاریک سایوں نے انسانیت کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، انسانی فکر و فلسفہ نے پوسٹ موڈرن ازم (Post Modernism) میں قدم رکھا۔ اس دور میں عقل اور عقیدہ کے بجائے جذبات کو حکمران بنا کر وجودِ انسانی کی سکوں بخشی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس کی ایک مثال وہ مادر پدر جنسی آزادی ہے جو تہذیب و اخلاق کے ہر بندھن کو توڑ چکی ہے۔ اور اب بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ ہم جنسی پرستی کے غیر فطری تعلق کو قانون کے بعد مذہب سے بھی سند جواز دلوانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

دوسری طرف اب جبکہ یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ سائنسی علوم کی روشنی میں حیات و کائنات کے بارے میں انسانی سوالات کا جواب دینا ممکن نہیں ہے، سائنسی علوم کی توجہ انسانی معاشرے اور فرد کی زندگی کو بہتر اور آسان بنانے پر مرکوز ہو چکی ہے۔ پوسٹ موڈرن ازم کے اِس دور میں سائنس مادی جذبات و احساسات کی تسکین کے لیے کنزیومرازم تخلیق کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے۔ یعنی انسان کے مادی وجود کو زیادہ آسانی، زیادہ تفریح اور زیادہ مزہ فراہم کیا جائے۔ مگر ان مادی ذرائع سے انسان نے پہلے کبھی سکون پایا اور نہ اب پا سکتا ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا یہ حل غفلت اور شیطنیت کا وہ امتزاج پیدا کرتا ہے جو بحر و بر کو فساد سے بھر دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسانی شخصیت

انسانی شخصیت کو سکونِ کامل کس طرح مل سکتا ہے، اس سوال کا جواب انسانی شخصیت اور اس کی ساخت کو سمجھنے پر منحصر ہے۔ انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے بے حد پیچیدہ واقع ہوا ہے۔ اس کی شخصیت کو جنم دینے اور اس کے اعمال کو تخلیق کرنے والے اندرونی اور بیرونی عوامل اس قدر متنوع، متضاد اور پیچیدہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ البتہ ہم کوشش کریں گے کہ وحی الٰہی سے حاصل ہونے والے علم کی بنیاد پر اور نفسیات، فلسفہ اور سائنس کی اس روشنی میں جو وحی الٰہی کے مطابق ہے، ان عوامل کی تفصیلات بیان کریں۔

انسانی شخصیت انسان کے اپنے وجود کے اندر کارفرما عوامل اور خارج کی اس زمین سے پھوٹتی ہے جس پر وجود کا یہ پودا جنم لیتا ہے۔ یہ خارجی زمین تین تہوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی تشکیل میں اس کے ظہور سے قبل ہی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان کو پہلے بیان کر دیتے ہیں۔

۱۔ وراثت

ماں باپ کے ذریعے نسل در نسل ملنے والی وہ نسبی اور نسلی خصوصیات جو انسان کو اس دنیا میں آنے سے قبل ہی مل جایا کرتی ہیں۔

۲۔ ماحول

انسان کے افکار و خیالات، عقائد و نظریات اور عادات و معمولات کا تعین کرنے والے وہ تمام عوامل جو ابتدا ہی سے اس کے اردگرد موجود رہتے ہیں اور غیر ارادی اور طور پر اس کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔

۳۔ تعلیم و تربیت

یہ وہ خارجی علم اور اصول ہیں جو معاشرہ کسی فرد کو اپنا ایک کارآمد جز بنانے کے لیے اسے دینا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ ان خارجی عوامل کے ساتھ انسان کی اپنی ساخت اس کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے دو بنیادی اجزا ہیں۔

۱۔ مادی وجود
۲۔ نفسی وجود

مادی وجود تین چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ حیوانی جسم، قد و قامت، رنگ و روپ، چہرہ و ناک نقشہ اور اعضا و قویٰ وغیرہ سے۔

۲۔ جبلی تقاضے: جو اس کی زندگی اور بقا کے ضامن ہیں مثلاً بھوک، پیاس، جنس، تحفظ و بقا وغیرہ۔

۳۔ روح حیوانی: یہ ایک نوعیت کا حیوانی شعور ہے جو حواس سے حاصل ہونے والی معلومات اور جبلتوں سے پیدا ہونے والے تقاضوں کی نوعیت متعین کرتا اور ان کے مطابق کچھ بنیادی جذبات (جیسے شہوت، خوف، قبولیت وغیرہ) کو تحریک دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شعور ایک طرح کی سمجھ بھی رکھتا ہے اور جذبات بھی، مگر یہ سرتاسر حواس اور جبلتوں کے تابع ہوتا ہے اور ان سے آزاد ہو کر فیصلہ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حیوانوں میں ان کی جنس کے اعتبار سے یہ شعور کچھ کم زیادہ تو ہو سکتا ہے، مگر یہ حواس اور جبلتوں سے بلند ہو کر خود مختارانہ عمل کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تاہم انسان کا حیوانی وجود اس کے وجود کے دوسرے جز سے مل کر روبہ عمل ہوتا ہے اور اسی لیے حواس اور جبلتوں سے بلند ہو کر عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ دوسرا جز انسان کا نفسی وجود ہے۔

۲۔ نفسی وجود

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کا اصل وجود یہی ہے۔ اسے فلسفۂ یونان میں روح، قرآن میں نفس اور علم نفسیات میں سیلف (Self) کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی ہستی یا انا کے شعور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفخ روح کے عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اسی مناسبت سے اسے روحانی وجود بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ اپنا ظہور ارادہ و اختیار کی شکل میں کرتی ہے اور اسی کی بنیاد پر یہ حیوانی شعور کو کنٹرول کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ اس کے تین بنیادی اجزا ہیں۔

۱۔ عقلی وجود

یہ نفس انسانی کا بنیادی جز ہے جسے عام طور پر مائنڈ (Mind) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوچ، یاد داشت، سمجھ، شعور، تجزیہ و تحلیل، غور و فکر، تصور و تخیل سب اسی کے اجزا ہیں۔ ہم انہیں ملا کر ایک عقلی وجود سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم عام طور پر اس کے لیے سمع، بصر اور قلب کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ انسان کا بنیادی شرف ہے جو اسے دوسری مخلوقات سے افضل بناتا ہے اور اسی کی بنیاد پر انسان اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوتا ہے۔

۱۔ خیر و شر کا شعور

اسے عام طور پر ضمیر (Conscience) کہا جاتا ہے۔ اسی کے تحت انسان مادی اور حیوانی تقاضوں سے بلند ہو کر صحیح و غلط کا فیصلہ کرتا ہے۔ قرآن کریم اسے نفس لوامہ کے نام سے بیان کرتا ہے۔

۲۔ ذوق انسانی

یہ انسانی وجود کا وہ گوشہ ہے جو اسے جمالیات کا شعور دیتا اور اس کی زندگی میں لطیف جذبات پیدا کرتا ہے۔ جمال حیوانیت کی ضروریات کو حسین خواہشات کا روپ دیتا اور لطافت جبلت کے کثیف جذبات کو اعلیٰ انسانی جذبوں میں ڈھالتی ہے۔

انسانی شخصیت ماں کے پیٹ ہی سے ان تمام اندرونی اور بیرونی عوامل کے تحت تشکیل پانا شروع ہو جاتی ہے اور جسمانی بلوغ کے ساتھ ہی انسان کی شخصیت کی بنیادی تشکیل کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

انسانی مسائل کی نوعیت

انسانی شخصیت کا یہ تجزیہ اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ کیوں دور جدید کی تمام تر ترقیاں اس کی زندگی کو تسکین فراہم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ارتقا کے نظریے کے پیش نظر جدید ذہن اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ انسان ایک مادی اور حیوانی وجود سے بڑھ کر بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ انسان کے نفسی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وجود کے مظاہر یعنی عقل، ضمیر اور ذوق انسانی کو اگر سمجھتا بھی ہے تو سرتا سر حیوانی وجود کی ایک ارتقا یافتہ شکل کی صورت سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی توجہات کا تمام تر مرکز صرف مادی اور حیوانی وجود رہ جاتا ہے۔ یوں ایک طرف تو نفسی وجود کے اپنے تقاضے آسودگی سے محروم رہ جاتے ہیں دوسری طرف اِس دنیا کی محدودیتیں انسان کے مادی تقاضوں کی تکمیل کی راہ میں بار بار رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی شخصیت مختلف مسائل اور بحرانوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہم تفہیم کی غرض سے ان کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جذباتی بحران، روحانی بحران اور عقلی عدم اطمینان۔

۱۔ جذباتی بحران

اوپر انسانی وجود کا جو تجزیہ ہم نے پیش کیا ہے، اس میں یہ بات واضح ہے کہ انسان کا اصل وجود اس کا نفسی وجود ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں یہ نفسی وجود انسان کے مادی وجود سے باہر باقی نہیں رہ سکتا۔ مزید یہ کہ اس مادی وجود کی زندگی و بقا کے لیے جو تقاضے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ ایک طرف حیوانی جبلتوں اور جذبات کی شکل میں لمحہ بہ لمحہ اپنا ظہور کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف انہیں ذوق انسانی کی شکل انسان کے نفسی وجود کے اندر اپنا وہ حمایتی بھی میسر ہے جو جمالیات کی آنچ پر ان ضروریات کو سلگتی ہوئی خواہشات کا روپ دے دیتا ہے۔ چنانچہ ضروریات، خواہشات اور ان کے پس پردہ کام کرنے والے جذبات زندگی بھر انسان کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ نتیجتاً اس کی عقل و شعور اور ارادے کی قوت مادی دنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس میں لذت کامل اور عیش دوام کی طلبگار ہو جاتی ہے۔ مگر یہ ایک ایسا خواب ہے جو اس دنیا میں شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اس راہ میں پہلے ہی قدم پر انسان کی محدودیتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ انسان کا ذوقِ جمال خواہشات کی جو ختم نہ ہونے والی پیاس پیدا کرتا ہے، انسان کے خارج کی دنیا اس کی تسکین کا کوئی ذریعہ فراہم نہیں کرتی۔ قدم قدم پر رکاوٹیں انسان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ اس کی انا کا بھرم، اس کی خواہشات کا گھروندا، اس کے خوابوں کا تاج محل اور اس کی امید کا دیا وقت اور حالات کی بے رحم آندھیوں کی زد میں آ کر بار بار برباد ہوتے رہتے ہیں۔

لوگ دنیوی نعمتوں کے حصول کے لیے مال و دولت کو اپنا نصب العین بناتے ہیں، مگر کتنے ہی لوگ ہیں جو تمام تر محنت و مشقت، صلاحیت و کوشش کے باجود اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انسان امید باندھتا اور خواہش کرتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے، مگر اپنی پسند اور خواہش کا گھر، بیوی، کیریئر اور معاشرے میں مقام کم ہی لوگ حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ غالب ترین اکثریت کے حصے میں سوائے محرومی، مایوسی، دکھ، غم اور الم کے کچھ نہیں آتا۔ پھر ان محرومیوں کے ساتھ، غربت، بیماری، اموات، دیگر لوگوں کے پیدا کردہ مسائل وغیرہ وقتے وقتے سے انسان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہر انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی جذباتی بحران کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر ملنے والی محرومیوں اور مایوسیوں سے پیدا ہونی والی جذباتی ہلچل شخصیت کو ایک مستقل عدم توازن کا شکار کر دیتی ہے۔ یا کم از کم اپنے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے جو زندگی کو کبھی نارمل نہیں ہونے دیتے۔ دور حاضر میں جب مادی چکاچوند نے خواہش کے عفریت کو بالکل بے لگام کر دیا ہے، انسانوں کا جذباتی بحران بہت بڑھ گیا ہے اور متعدد نفسیاتی بیماریاں بہت عام ہو گئی ہیں۔

۲۔ روحانی بحران

دنیا میں بہت سے لوگ مادی دوڑ میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے مسائل کی ایک دوسری دنیا جنم لیتی ہے۔ جو لوگ یہ کامیابیاں حاصل کر لیں ان پر یہ بھیانک انکشاف ہوتا ہے کہ اس دنیا کی ہر نعمت ملنے کے ساتھ ہی اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ اس دنیا کا حسن، ذائقہ، لذت اور سماعت گو ذوق جمال کو وقتی طور پر خوشی و مسرت دیتے ہیں لیکن جس طرح کسی تپتے ہوئے صحرا کی پیاس بارش کی کوئی ایک بوچھاڑ نہیں بجھا سکتی اسی طرح خواہشات کا ریگزار مادی نعمت کی ہر بوچھاڑ کے بعد بھی سدا کا پیاسا ہی رہتا ہے۔

لذتیں حواس کی تسکین تو کر سکتی ہیں، مگر نفس انسانی کی تسکین ان کے بس کی بات نہیں۔ ہر لذت ملنے کے فوراً بعد اپنی کشش کھو دیتی ہیں۔ اس کے بعد بوریت، یکسانیت اور اکتاہٹ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ایک کے بعد دوسری خواہش کے پیچھے بے تحاشہ دوڑ پڑتا ہے۔ مادیت کی صحرانوردی میں ہمہ وقت اڑنے والی غفلت کی ریت آہستہ آہستہ انسان کے روحانی وجود کو مادیت کی قبر میں دفن کر دیتی ہے۔

مگر خدا کی پھونکی ہوئی روح (حجر 29:15) سے براہ راست پیدا ہونے والا یہ وجود حیوانی شعور سے جنم لینے والے تقاضوں سے کبھی اپنی تسکین پا سکتا اور نہ مادیت کی قبر میں دفن ہونے کے بعد موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مادیت کی اس قبر میں بھی زندہ رہتا ہے اور اس وقت کا انتظار کرتا ہے کہ جب انسانی ضمیر حیوانیت کو مغلوب کر کے زندگی کا ایک برتر نصب العین عقل و ارادہ کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بدقسمتی سے ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری طرف خواہشات کی منزل کو پانے کے لیے اکثر حالات میں انسان ضمیر ہی کا گلا گھوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس پر حیوانی شعور تو شائد کوئی احتجاج نہ کرے، مگر انسان کا ضمیر اس پر اپنا خاموش احتجاج مسلسل جاری رکھتا ہے اور انسان کو ختم نہ ہونے والے اضطراب کا شکار کر دیتا ہے۔ گرچہ ضمیر کا گلا گھونٹنا آسان نہیں، مگر کوئی بد بخت ضمیر کو بھی خواہش کے اسی صحرا میں دفن کر دے تو پھر وہ شیطان بن جاتا ہے۔ شیطان دوسروں کو جو بھی اذیت دے، مگر اپنے وجود کی آگ میں لمحہ لمحہ جلنا اس کا مقدر ہوتا ہے۔

۳۔ عقلی عدم اطمینان

جذباتی بحران اور روحانی اضطراب سے نمٹنے کے لیے انسان اپنے ماحول اور تربیت کے مطابق مذہب کی پناہ تلاش کرتا ہے۔ یہ مذہب شاید ان پہلوؤں سے آنسو پونچھنے کا کچھ نہ کچھ سبب بن بھی جائے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ انسان اصلاً ایک عقلی وجود ہے۔ وہ خود اس کائنات کی اور اس میں اپنی ذات کی ایک علمی و عقلی توجیہہ چاہتا ہے۔ جس دین و مذہب اور تہذیب کا وہ حصہ ہوتا ہے، اس کے عقائد، قوانین، روایات اور مراسم وغیرہ کی ایک معقول توجیہہ بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص کر جدید انسان اس توجیہہ کے بغیر نہیں جی سکتا۔ مشرکانہ مذاہب اور متصوفانہ روایات ان عقلی سوالات کے جو جواب دیتے ہیں وہ کسی عام آدمی کو شائد مطمئن کر دیں، مگر اہل فکر و دانش کو تو وہ نفس مذہب سے بیزار کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد انسان کے پاس نہ اپنے وجود کی کوئی توجیہ باقی رہتی ہے اور نہ کائنات کی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عقل بھی ایک مستقل عدم اطمینان کی حالت میں رہتی ہے۔

قدیم حل اور اس کی تاریخ

انسان کے یہ مسائل آج پیدا نہیں ہوئے بلکہ اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان۔ لیکن توحید خالص اور پیغمبروں کی رہنمائی میں اپنے سفر کا آغاز کرنے والا انسان وہ زادِ راہ اپنے پاس رکھتا تھا جس میں ان مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت تھی۔ تاہم خالص الہامی مذاہب میں شرک کی آمیزش نے ہر دور میں فساد برپا کر کے اس سکون کو درہم برہم کیا۔ اس پس منظر میں تصوف (Mysticism) کی عالمی روایت نے جنم لیا۔ تصوف کی یہ روایت جو الہامی مذاہب میں در آنے والے فلسفیانہ رجحانات سے متاثر تھی، شرک سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور مادیت پر مبنی ظاہر پرستانہ رجحانات کا ایک علاج بن کر سامنے آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں انسان کے جذباتی اور روحانی بحران کا بڑی حد تک ازالہ کرنے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انہی خصوصیات کی بنا پر تصوف کو بین اقوامی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ تصوف کی یہ روایت مذہب کے متوازی ہر دور میں موجود رہی اور مختلف مذاہب اور علاقوں میں مختلف ناموں سے سامنے آئی۔ ویدانت (ہندومت)، زین ازم (بدھ مت)، طاؤازم (چین)، کبالہ (یہودیت) اور صوفی ازم (اسلام) وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ جس طرح اسلام دنیا کی آخری بڑی مذہبی روایت ہے، اسی طرح مسلمان صوفیا نے تصوف کو علمی اور عملی طور پر اس کی معراج پر پہنچا دیا۔ انہوں نے ہزار برس تک قائم عظیم مسلم سلطنت میں پیدا ہونے والے روحانی اور اخلاقی خلا کو بھرنے اور مادی دنیا کے جذباتی صدموں سے نڈھال انسان کو سکون دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اپنے فلسفیانہ انحرافات سے قطع نظر، اس خدمت کو اعلیٰ ترین سطح پر سرانجام دیا۔

اسلام اور تصوف

مسلمانوں کی تاریخ میں تصوف کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے وہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ ہماری تاریخ میں بڑے بڑے اہل علم سے لے کر عوام الناس تک تصوف کے فکر و فلسفے اور پیغام سے متاثر رہے ہیں۔ ایک طرف اہل تصوف کے زہد، اخلاص، خدا ترسی، حسن خلق اور مخلوق کے ساتھ شفقت نے ان کو عام لوگوں کی نگاہوں میں ہمیشہ بہت غیر معمولی مقام عطا کیا تو دوسری طرف تصوف کے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) پہلوؤں نے صدیوں تک ہمارے ذہین ترین اصحاب علم کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ چوتھی صدی سے لے کر تیرہویں صدی ہجری تک اس امت کی فکری قیادت، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، ان اہل علم کے ہاتھ میں رہی ہے، جو تصوف سے متعلق تھے۔

تصوف کی ایک حیثیت وہ ہے جس میں یہ ایک علمی و فکری روایت اور فلسفیانہ نقطۂ نظر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس حیثیت میں یہ خدا اور مخلوق کے باہمی تعلق کی نظریاتی بنیادوں کو واضح کرتا، دین کے پیش نظر مقاصد کو متعین کرتا اور ان مقاصد کے حصول کے ذرائع کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ تصوف کی دوسری حیثیت ایک اخلاقی روایت کی ہے۔ اس اخلاقی روایت میں یہ انسان کے روحانی وجود کی تسکین کرتا، نفس انسانی میں پائی جانے والی آلائشوں کی تطہیر کرتا، انسان میں پائی جانے والی حیوانی جبلتوں کی تعدیل کرتا، باہمی معاملات میں اخلاق او رایثار کے اعلیٰ رویوں کی تلقین کرتا، اور مخلوق خدا کی خیر خواہی کا سبق دیتا ہے۔

تصوف کی پہلی حیثیت اور اس کی بنا پر پیدا ہونے والی بے عملی اور بے اعتدالی کو قدیم اور جدید اہل علم نے ہر دور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف کا مابعد الطبیعاتی پہلو اصلاً قبل از اسلام موجود فلسفوں اور متصوفانہ (Mystic) مذاہب، روایات اور طریقوں سے ماخوذ ہے۔ یہ جن چیزوں کو حقائق کے نام پر بیان کرتا ہے وہ دین کی بنیادی دعوت اور قرآن پاک کے بیانات میں نہ صرف اپنی کوئی اساس نہیں رکھتے بلکہ حقیقت کی ایک بالکل مختلف تصویر سامنے لاتے ہیں۔ مغلوب الحال صوفیوں کے حالات و اقوال اور ائمہ تصوف کی کتابوں میں جب ان چیزوں کا کھلا ظہور ہوا، یہ تب بھی اہل علم کی تنقید کا ہدف بنیں اور جب تصوف کی راہ سے ترک دنیا کا فلسفہ اور بے عملی کی تعلیم معاشرے میں رواج پانے لگی، تب بھی تصوف اہل علم و دانش کی تنقید کا نشانہ بنا۔ (تصوف کے نظری پہلو پر تنقید کے لیے دیکھیے استاذ گرامی کی کتاب 'برہان' میں ان کا مضمون 'اسلام اور تصوف')۔

تاہم تصوف کا دوسرا پہلو جسے ہم نے تصوف کی اخلاقی روایت سے تعبیر کیا ہے، حقیقتاً انسانی معاشرے کی ایک ضرورت ہے اور اس پہلو سے اس کی بڑی خدمات ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر زمانۂ قدیم ہی سے صوفیا معاشرے کے اخلاقی انحطاط کے سامنے بند باندھتے اور جذباتی انتشار، ذہنی پریشانی اور روحانی پیاس کا شکار افراد کی قلبی طمانیت کا سامان کرتے رہے ہیں۔ البتہ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ نظری طور پر قرآن کی تعلیمات سے بعض سنگین اختلافات کے باجود تصوف مسلمانوں میں کس طرح سرایت کر گیا۔ آگے بڑھنے سے قبل اس سوال کا تفصیلی جواب دینا بہت ضروری ہے۔

مسلمانوں میں تصوف کے فروغ کی تاریخ

مسلم معاشرے میں صوفی روایت اور تصوف کے باقاعدہ آثار دوسری صدی ہجری میں نظر آتے ہیں۔ صوف یعنی اون کا وہ کھردرا اور موٹا اونی لباس جس کے پہننے کا مقصد زیب و زینت سے زیادہ ستر پوشی تھا، دوسری صدی ہجری تک صوفیا کی نشانی بن چکا تھا۔ ان کو صوفیوں کا یہ نام ہی اس لباس کی بنا پر ملا۔ ابو ہاشم الکوفی (م 150ھ) وہ پہلا شخص تھا جسے باقاعدہ صوفی کے نام سے یاد کیا گیا۔

تاہم پہلی صدی ہجری تک صورتحال ذرا مختلف تھی۔ اُس زمانے میں زہد موجود تھا، مگر ابھی وہ تصوف کے قالب میں نہیں ڈھلا تھا۔ اسلامی تعلیمات میں ترکِ دنیا کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ متصوفانہ رجحانات مسلمان اہل علم میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ صوف کا لباس مسلمانوں میں 'زی الرھبان' یعنی راہبوں کا لباس کہا جاتا اور مسیحیت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اُس دور میں محمد ابن سیرین (م 110ھ)، ابوالعالیہ (م 90ھ)، حماد بن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سلمہ (م 167ھ) اور سفیان ثوری (م 167ھ) جیسے نمائندہ اہل علم نے اس کی سخت مخالفت کی۔

ان حالات میں تصوف کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی اُن نظریاتی اساسات کی بنیاد پر مسلم معاشرے میں سرایت کر جاتا جو بعد میں اس کی پہچان بنیں اور جنہیں شیخ ابن عربی (م 638ھ)، امام غزالی (م 505ھ)، امام ابوالقاسم قشیری (م 465ھ) اور شیخ ابو طالب مکی (م 386ھ) جیسے ائمہ تصوف نے اپنی کتابوں میں بیان کیا۔ مسلم معاشرے میں تصوف کے فروغ کی وجہ اس کی وہ اخلاقی روایت تھی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا اور جو پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے سیاسی، سماجی، معاشی اور علمی حالات کی بنا پر سوسائٹی کی ایک اہم ضرورت بن کر سامنے آئی تھی۔

ابتدائی صدیوں میں مسلم معاشرے کے حالات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول تھے۔ تمام نبیوں کی طرح ایمان و اخلاق کی شمع روشن کر کے لوگوں کو سچا خدا پرست انسان بنانا اور ان کی شخصیت کو تمام علمی، عملی اور اخلاقی آلائشوں سے پاک کرنا آپ کی تعلیم کا بنیادی نصب العین تھا۔ یہی آپ کا عطا کردہ ضابطۂ نجات اور نبوی ماڈل تھا اور ساری زندگی آپ نے اسی کی طرف لوگوں کو بلایا۔

تاہم نبی ہونے کے ساتھ آپ ایک رسول بھی تھے اور اس حیثیت میں آپ کی بعثت کا بنیادی مقصد شرک پر مبنی اس دور کا خاتمہ تھا جس نے ایک طویل عرصہ سے انسانی زندگی میں فساد پیدا کر رکھا تھا۔ آپ کا مشن جزیرہ نما عرب سے شرک کو مٹانا تھا۔ آپ کے صحابۂ کرام کا یہ منصب تھا کہ وہ آپ کے لائے ہوئے پیغام کے گواہ بن کر انسانیت تک توحید کا پیغام پہنچا دیں۔ نیز مشرقِ وسطیٰ کے علاقے سے جو آل ابرہیم کی میراث کا علاقہ تھا، دینِ شرک کی کمر توڑ کر اس علاقے میں توحید کا پرچم بلند کر دیں۔ (اس بات کو اس کے پورے پس منظر میں سمجھنے کے لیے دیکھیے استاذ گرامی کی تصنیف میزان کے باب قانون دعوت میں 'ذریت ابراہیم کی دعوت' اور راقم کی کتاب 'عروج و زوال کا قانون اور پاکستان' میں 'آل ابراہیم کا عروج و زوال' کی بحث)۔ ہجرت کے بعد جب کفار پر اتمام حجت ہو گیا تو اس مشن کا آغاز ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ مشرکانہ قوتوں کی طرف سے اس توحیدی مشن کی مخالفت اور مزاحمت ہونا ہی تھی۔ چنانچہ جہاد و قتال کا آغاز ہوا اور پھر جنگوں کا ایک مستقل سلسلہ ہے، جو سیرتِ طیبہ کے مدنی دور میں غالب نظر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانے میں مشرقِ وسطیٰ کے بادشاہوں کو خطوط لکھ کر اس دائرہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کار کو طے کر دیا جس میں رہ کر صحابۂ کرام کو اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ چنانچہ حضور کے زمانے ہی سے ان قوتوں سے ٹکراؤ شروع ہو گیا جن میں اپنے زمانے کی دو عظیم سپر پاور یعنی فارس اور روم کی سلطنتیں نمایاں ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سیدنا عثمانؓ کے عہد کے ابتدائی حصے تک مسلمان ان دونوں کے ساتھ مستقل حالت جنگ میں رہے۔ آخر کار مسلمانوں نے سلطنتِ فارس کا خاتمہ کر دیا اور روم کے تمام ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کر کے اس کی کمر توڑ دی۔ اس عمل کے نتیجے میں مشرکانہ تہذیب مغلوب ہو گئی اور ان تمام علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یوں صحابۂ کرام کا مشن مکمل ہو گیا۔ تاہم اس دوران میں مسلم معاشرے میں ایک بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ وقت گزرنے کے ساتھ رسول اللہ کے فیض یافتہ صحابہ کی تعداد کم ہوتی گئی اور مال و دولت کی بے پناہ کثرت ہو گئی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے اور شام و عراق کی سونا اگلتی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں، لیکن غیر تربیت یافتہ نو مسلموں کے زیر اثر مسلمانوں کی وہ اخلاقی روایت متاثر ہونے لگی جو نورِ نبوت کے فیضان سے مدینہ کے معاشرے میں روشن تھی۔

سیدنا عثمان کے عہد میں مسلمانوں کے باہمی خلفشار کا آغاز ہوا اور پھر ان کی مظلومانہ شہادت کے ساتھ ہی مسلمانوں میں باہمی جنگ و جدال کا آغاز ہو گیا۔ سیدنا علیؓ کا پورا دور اسی جنگ و جدال اور انتشار میں گزرا۔ اس کے بعد بنو امیہ کا تقریباً ایک صدی پر محیط عرصہ مستقل بغاوتوں، جنگوں اور خانہ جنگیوں سے عبارت ہے۔ اس عرصہ میں سیدنا حسینؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت اور مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں کی بے حرمتی جیسے المناک واقعات پیش آئے۔ اس کے علاوہ بھی باہمی جنگوں کے دیگر ان گنت واقعات میں صالحین کی بڑی تعداد اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ 132ھ میں بنو امیہ کا خاتمہ علویوں (حضرت علی کی اولاد و وابستگان) اور عباسیوں کی ایک بڑی بغاوت کے نتیجے میں ہوا۔ تاہم امن ابھی لوگوں کے نصیب میں نہ تھا۔ پہلے عباسیوں نے بنو امیہ پر ظلم و ستم کے بدترین پہاڑ توڑے۔ اس کے بعد علویوں اور عباسیوں کا باہمی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ علویوں کی پے در پے بغاوتوں کے نتیجے میں خلیفہ منصور کے زمانے تک یعنی اگلے بیس برس مسلم معاشرہ خانہ جنگی کی ایک مستقل کیفیت میں رہا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک کے یہ وہ حالات ہیں جن میں ایک طرف مسلم معاشرے میں مال و دولت کی بے پناہ کثرت تھی اور دوسری طرف مستقل جنگ و جدال اور بدامنی کا ماحول تھا۔ ان حالات میں ایک مسلمان کی ضرورت تھی کہ مادیت کے ماحول میں اس کے روحانی ارتقا اور بدامنی کی فضا میں ذہنی و قلبی سکون کے لیے مذہبی قیادت آگے آتی اور قرآن پاک کی روشنی میں اس کی رہنمائی کرتی۔ بدقسمتی سے یہ نہیں ہو سکا۔ صالحین کی ایک

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بڑی تعداد مستقل جنگوں میں مصروف رہی، چاہے وہ خارجی قوتوں کے خلاف تھیں یا بنوامیہ کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کی شکل میں۔ باقی اہل علم کی توجہ ایک عظیم مسلم ریاست کے قانونی نظام کی تشکیل کے لیے فقہی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگی۔ فقہا کی آرا کے ردعمل میں لوگوں نے دینی احکام کو احادیث سے جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ائمہ اربعہ کا کام دوسری اور تیسری صدی میں سامنے آیا۔ اسی عرصے میں صحاح ستہ کی تدوین ہوئی۔ مسلمان اہل علم فقہ اور حدیث کی تدوین سے فارغ ہوئے تو یونانی فکر و فلسفہ سے مسلم معاشرے میں در آنے والے کلامی مباحث کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چوتھی صدی کے نصف اول میں امام ابوالحسن اشعری (م 324ھ) اور امام ابومنصور ماتریدی (م 332ھ) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عقائد کے حوالے سے پیدا ہونے والے کلامی مباحث پر علمی کام کیا۔

اس جائزے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جب مستقل خانہ جنگی کی وجہ سے ذہنی پریشانی اور مال و دولت کی فراوانی کی بنا پر پیدا ہونے والے روحانی خلا اور اخلاقی بگاڑ جیسے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت تھی، مسلمان اہل علم کی ترجیحات جنگ و سیاست، فقہ و حدیث اور فلسفہ و کلام بنی رہیں۔ ابتدائی صدی میں اس صورتحال میں ایک نمایاں استثنا حسن بصری (م 110ھ) کا تھا۔ آپ ایک جلیل القدر تابعی، مفسر اور محدث تھے۔ ام المومنین ام سلمہ کے گھر پرورش پانے والے حسن بصری (پیدائش 21ھ) نے صحابۂ کرام کا کافی زمانہ پایا۔ اپنے دور کے انتشار اور صحابۂ کرام کے دور کے بعد آنے والے اخلاقی انحطاط کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ وہ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نظر، صاحبِ درد اور قادر الکلام خطیب بھی تھے۔ ان کے مواعظ کی اثر آفرینی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں ان کے کلام کو نبیوں کے کلام کی طرح قرار دیا۔

ان کی کوششوں کے نتیجے میں ایک فضا پیدا ہوئی مگر بدقسمتی سے ان کے بعد یہ میدان اہل علم کی دلچسپی کا موضوع نہ بن سکا۔ جبکہ معاشرے کی اخلاقی تربیت کرنا اور ربانی تعلق کی درست جہت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنا بہرحال معاشرے کی ضرورت تھی جو اُس دور کے معروضی حالات میں زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک زبردست خلا پیدا ہوا۔ انسانی ضروریات کی طلب سے پیدا ہونے والا کوئی خلا کبھی باقی نہیں رہتا۔ یہ خلا تصوف کی تحریک نے بھر دیا۔ مسلم معاشرے کے زہد اور غیر مسلم فلسفوں اور روایات سے متاثر تصوف کی تحریک اس فضا میں غیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محسوس طریقے سے اپنی جگہ بناتی چلی گئی اور دوسری اور تیسری صدی میں عوام وخواص دونوں میں مقبول ہوگئی۔

تصوف کا عروج وزوال

تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد جب عباسی خلفا کے زیر حکومت مسلم معاشرہ علمی، تمدنی، معاشی اور معاشرتی پہلو سے اپنے عروج پر تھا، اسی دور میں تصوف کی روایت بھی وقت کے بہترین لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی (م 297ھ)، شیخ بایزید بسطامی (م 261ھ)، شیخ سری سقطی (م 253ھ)، شیخ ذوالنون مصری (م 245ھ)، شیخ ابوبکر شبلی (م 334ھ) اور شیخ ابوالقاسم گرگانی (م 450ھ) جیسے اکابرین نے اگر تصوف کی عملی روایت کو منتہائے کمال پر پہنچایا تو سہل بن عبداللہ تستری (م 283ھ)، شیخ ابوطالب مکی (م 386ھ)، امام ابوالقاسم قشیری (م 465ھ)، شیخ علی ہجویری (م 465ھ)، امام غزالی (م 505ھ)، شیخ عبدالقادر جیلانی (م 561ھ)، شیخ شہاب الدین سہروردی (م 632ھ)، شیخ ابن عربی (م 638ھ) اور جلال الدین رومی (م 672ھ) جیسے صوفیوں نے عملی روایت کے ساتھ علم اور قلم کی طاقت کے ساتھ تصوف کے اسرار و رموز کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کیا۔

تاہم پانچویں صدی ہجری میں تصوف کا افراط و تفریط سامنے آنے لگا تھا۔ اس لیے اس پر شدید تنقید شروع ہوگئی۔ پانچویں صدی میں اس تنقید کا آغاز ابن حزم (م 456ھ) نے کیا۔ چھٹی صدی میں ابن جوزی (م 597ھ) اور پھر امام ابن تیمیہ (م 728ھ) اور ان کے شاگرد ابنِ قیم (م 791ھ) نے اس تنقید کو عروج پر پہنچا دیا۔ یہ تنقید آنے والے زمانے میں اگر جاری رہتی تو بہت عرصے قبل ہی تصوف کی روایت ختم ہو جاتی یا کم از کم اس کا اثر بہت محدود ہو جاتا۔ تاہم اس عرصے میں مسلم دنیا کو ایک زبردست سانحے کا سامنا کرنا پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں کی علمی روایت کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا بلکہ وہ حالات پیدا کر دیے جن میں لوگوں کے لیے سکون و عافیت کی واحد جائے پناہ گوشۂ تصوف تھا۔

یہ سانحہ تاتاریوں کا مسلم دنیا پر حملہ تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں وسطی ایشیا سے لے کر مشرق وسطی تک تمام عالم اسلام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم دنیا کے تمام تہذیبی اور علمی مراکز (بجز اسپین کے جو بعد میں مسیحیوں کے ہاتھوں برباد ہوگیا) اس آفت کی نذر ہوگئے۔ اس فتنہ کا نقطۂ عروج بغداد کی تباہی کا سانحہ تھا جو 1258ء (بمطابق 656ھ) میں پیش آیا۔ جس کے بعد مسلم دنیا پر تباہی و بربادی کی وہ المناک رات مسلط ہوئی جس کی مثال

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ مسلم معاشرہ، ریاست، سیاست، علم، تہذیب غرض ہر شعبۂ زندگی پر اس کے ایسے منفی اثرات مرتب ہوئے جن سے مسلمان کئی صدیوں تک باہر نہ نکل سکے۔ مسلمانوں نے سیاسی اعتبار سے اپنا کھویا ہوا مقام سلطنتِ عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کی شکل میں کسی نہ کسی طرح واپس لے لیا، لیکن علمی طور پر وہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ ایسے تباہ حال مسلم معاشرے میں اہل تصوف کا اثر و نفوذ مزید بڑھ گیا۔ خاص کر عالمِ عجم میں تصوف کی مختلف شاخوں اور خانوادوں کے سلسلے پھیلتے چلے گئے۔ اہلِ شریعت کے بالمقابل اہلِ طریقت ہی اصلاً معاشرے کی فکری قیادت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

اس دور میں ہندوستان مسلمانوں کا فکری مرکز بن چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم اقتدار کا یہ واحد خطہ تھا جو فتنہ تاتار سے محفوظ رہا تھا۔ چنانچہ پورے وسطی ایشیا، ایران اور مشرق وسطیٰ سے مسلم شرفا، علما اور صوفیا ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ سرزمینِ ہند اپنے سیاسی حالات، تاریخی پس منظر، مذہبی روایت اور فلسفیانہ افکار کی بنا پر تصوف کے پودے کی زرخیری کے لیے ایک بہترین جگہ تھی۔ چنانچہ شجرِ تصوف یہاں خوب پھلا پھولا اور اس کے بطن سے خواجہ معین الدین چشتی (م 627ھ)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م 633ھ)، خواجہ فرید گنج شکر (م 664ھ)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م 665ھ) اور شیخ نظام الدین اولیا (م 725ھ) جیسے اکابرینِ تصوف نے جنم لیا۔

مغلیہ سلطنت کے زمانے تک ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت غیر مقامی حکمرانوں کی نہیں رہی تھی بلکہ بحیثیت قوم یا گروہ ان کا اجتماعی تشخص واضح ہونے لگا تھا۔ لیکن حکومت کے باجود ہندوستان میں مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہرحال اقلیت میں تھے۔ دوسری طرف اس معاشرے میں اہل تصوف کی حیثیت صرف صوفیا ہی کی نہیں بلکہ مسلم معاشرے کے فکری رہنماؤں کی بھی تھی۔ اس پس منظر میں ہند میں تصوف کی روایت علمی اور سیاسی طور پر بھی فعال ہونے لگی۔ اس میں ایک طرف شیخ احمد سرہندی (م 1033ھ) جیسے صاحبِ علم و فضل اور صاحبِ عزیمت لوگ پیدا ہوئے تو دوسری طرف شاہ ولی اللہ (م 1762ء بمطابق 1176ھ) جیسے بے نظیر عالم اور مدبر پیدا ہوئے جن کی نظیر تاریخ اسلام میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک مثال سید احمد شہید (م 1831ء بمطابق 1246ھ) اور شاہ اسماعیل (م 1831ء بمطابق 1246ھ) کی ہے جو صاحبِ سیف و قلم تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ دونوں بزرگ تصوف کی روایت سے منسلک تھے، خاص کر شاہ اسماعیل صاحب جن کی تصنیف 'عبقات' تصوف کی ایک بہت اہم کتاب ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسلمانوں کا زوال اور تصوف

انیسویں اور بیسویں صدی کا زمانہ مسلمانوں کے ہمہ جہتی زوال کا دور تھا۔ عالمِ اسلام تقلید و جمود کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ علمی و فکری جمود اور سیاسی و معاشرتی انحطاط کی لہر ہر جگہ اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔ دوسری طرف اہلِ مغرب تقلید کی بیڑیاں کاٹ کر اور علم و عقل کو امام بنا کر موڈرن ازم یعنی جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ سائنسی اور سماجی علوم میں ترقی کے ہتھیار سے لیس ہو کر نکلے اور پورے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس کے ردعمل میں عالم اسلام میں جو احیائی تحریکیں یا افکار وجود میں آئے، ان سب نے یہ محسوس کیا کہ تصوف اس جمود و بے عملی کو پیدا کرنے میں ایک بنیادی کردار ادا کر رہا ہے اور تصوف کی اعلیٰ اخلاقی روایات گدی نشینوں کے مفادات پر قربان ہونے لگی ہیں۔ اس صورتحال پر اقبال (م 1938ء) جیسے بڑے لوگوں نے تنقید کی اور اپنی پرجوش شاعری سے لوگوں کو علمی و عملی جمود توڑنے پر آمادہ کیا۔ اِس زمانے میں سیاسی حالات سے متاثر ہو کر جو مسلم احیائی تحریکیں وجود میں آئیں ان میں اہل تصوف کا زیادہ کردار نہ تھا۔ مزید یہ کہ ابن تیمیہ کے زیر اثر عرب میں جو احیائی تحریک اٹھی وہ تصوف کے قطعاً خلاف تھی۔ خود برصغیر میں پیدا ہونے والی اسلام کے سیاسی انقلاب کی تعبیر اپنی روح کے اعتبار سے تصوف کے خلاف تھی۔ اس سے وابستہ بڑے اہل علم نے تصوف پر شدید تنقیدیں کیں۔ امت کی تاریخ میں ایک طویل عرصہ بعد فکری قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو تصوف کے خلاف تھے یا اس سے زیادہ ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ نیز جدید تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحانات بھی اس بات میں مانع ہوئے کہ لوگ اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے منہ پھیر لیں۔ مسلم معاشرہ مغرب کی جدیدیت کا براہِ راست اثر قبول کر رہا ہے جس میں تقلید کے مقابلے میں آزادی اور باطنی تجربات و مشاہدات کے مقابلے میں عقلیت کو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر مسلم معاشرے میں اہل تصوف کے کردار کو بہت محدود کر دیا ہے اور زمانۂ قدیم کی طرح آج اعلیٰ اذہان تصوف کی تحریک سے کم ہی وابستہ نظر آتے ہیں۔

ایک نیا روحانی خلا اور انسان کی تلاش

تاہم یہ ایک حقیقت تھی اور ہے کہ تصوف نے جن بنیادوں پر ابتدائی زمانے میں امت میں اپنی جگہ بنائی تھی وہ آج بھی پوری طرح نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنی شدت میں کہیں زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ مغرب جو دورِ جدید میں انسانیت کا امام ہے، اس مسئلے کے حل کے لیے اس کی کوششوں اور ناکامی پر کچھ تبصرہ ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ لیکن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس حوالے سے خود ہمارے ہاں حالات اچھے نہیں۔ یعنی بے سکونی و بدامنی کا وہ ماحول جو ذہنی سکون سے لوگوں کو محروم کر رہا ہے، مال و دولت کی فراوانی میں مادی وجود پر حد سے زیادہ توجہ، جو شخصیت کے توازن کو بگاڑ رہی ہے، مذہب کی وہ سیاسی تعبیر جس نے نفسِ انسانی کی پاکیزگی کے بجائے سیاسی انقلاب کو اپنا موضوع بنا کر معاشرے میں ایک مستقل ہنگامہ آرائی برپا کر رکھی ہے، مادہ پرستی کی وہ دوڑ جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے انحطاط کا سبب بن رہی ہے اور ظاہری دینداری کا وہ ہنگامہ جو روحانی وجود کی عدم تسکین کا باعث بن چکا ہے۔

مسلم تاریخ کی ابتدائی صدیوں کی طرح آج بھی امت کی مذہبی اور فکری قیادت کی توجہات کا اصل مرکز فرد نہیں ہے۔ ان کے لیے زیادہ اہم کام قومی و سیاسی مسائل، علمی اور فکری چیلنجز، قدامت پسند دینی روایت کا احیا وغیرہ بن چکے ہیں۔ فرد کی شخصیت، تطہیرِ اخلاق، روحانی اور مادی عناصر میں توازن، خدا اور بندے کا درست تعلق، مخلوق سے درست رویہ، دنیا میں رہتے ہوئے فکرِ آخرت کی سوچ، اپنے مفاد اور تعصّبات سے بلند ہو کر سوچنے کی صلاحیت جیسی اقدار اب کم ہی لوگوں کا موضوع رہ گئی ہیں۔

مغرب و مشرق میں دورِ جدید کی تیز رفتاری اور انتشار کا مارا ہوا انسان عرصے سے اپنے اس خلا کو بھرنے کی تلاش و جستجو میں ہے۔ اس تلاش میں اس نے کبھی چرچ کی مشرکانہ آغوش میں لوٹ جانے کو گوارا کیا جس کی علمی کمزوریوں اور عملی خرابیوں سے وہ نکل بھاگا تھا اور کبھی بدھ مت اور ہندو دھرم جیسے متصوفانہ مذاہب میں جائے پناہ تلاش کی۔ کبھی ہپی ازم کی موسیقی، منشیات اور بے فکری میں اپنی بے سکونی کا حل ڈھونڈا تو کبھی تصوف کو ایک نئے بین الاقوامی نام یعنی اسپریچوالٹی (Sprituality) کے ساتھ اختیار کیا جو عقیدے، شریعت اور عقلیت تینوں سے بلند ہو کر آزادی، جذباتی تسکین اور انسانیت کی بنیاد پر داخلی سکون کا راستہ دکھاتا ہے۔ کبھی اس نے روحانیت کا بدل جذبۂ قوم پرستی میں جانا اور کبھی ماضی کی عظمتِ رفتہ کے حصول کو مقدس مذہبی مشن بنا کر انسانوں کی روحانی طلب کو اس ذریعے سے پورا کرنا چاہا۔

انسان کا مسئلہ اسلام کی نظر میں

مادیت کے اس دور میں جب انسانیت حقیقی اور کامل سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے اور جدید و قدیم تمام طریقے اس کے مسائل کو حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں، یہ دینِ حق، اسلام کی خالص اور بے آمیز دعوت ہے جو انسان کو دنیا و آخرت کی کامیابی، حسنات اور سکون کی بشارت دیتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلام انسان کے مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے، اس بات کو جاننے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام انسان کے مسائل کو کس طرح دیکھتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق انسان اصلاً اس دنیا کا باسی نہیں اور نہ اس کے لیے بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق اس کی زندگی کا مقصد جنت کی ابدی نعمتوں کے درمیان میں خدا کی رفاقت اختیار کرنا ہے، (قمر 54:55-54)۔ یہ رفاقتِ اعلیٰ کوئی ایسی چیز نہیں جو بلا استحقاق کسی کو دے دی جائے۔ انسان اس رفاقت کا حقدار اس وقت بنتا ہے جب وہ یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ وہ خدا کو بن دیکھے بھی اس کی مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ اس دنیا کی وہ مختصر زندگی ہے جس میں انسان خدا کو دیکھ نہیں سکتا اور اس حالت میں اسے خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ یہی اس کا امتحان ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں پیش آنے والے اچھے برے حالات میں جو اس کی آزمائش کا ایک حصہ ہیں، (انبیا 35:21) اسے خدا پرستی کی راہ پر قائم رہنا ہے۔ امتحان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسے ایک طرف اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو ان تمام مادی آلائشوں سے بچا کر اپنا تزکیہ کرتے رہنا ہے جن کا علم اسے نفس میں ودیعت کردہ خیر و شر کے فطری شعور اور نبیوں کی رہنمائی سے ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں سرخرو ہونے کا نتیجہ آخرت کی ابدی زندگی میں خدا کے انعام کا حصول ہے۔ جبکہ ناکامی کا مطلب ایک برے انجام کا سامنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے اعتبار سے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا فرمایا ہے، (تین 4:95)۔ اس ساخت کی تفصیل ہم 'انسانی شخصیت' کے عنوان سے پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ یہ ساخت نہ صرف انسان کو اس مقصود کے حصول کے لیے تیار کرتی ہے، بلکہ وہ امتحان بھی پیدا کر دیتی ہے جس سے گزر کر انسان اپنے مقصد کو پا سکتا ہے۔ انسان کا اپنا وجود بیک وقت اس کی آزمائش بھی ہے اور اس کے مقصد کے حصول میں معاون بھی۔ آزمائش اس پہلو سے کہ انسان کی حیوانی جبلتیں اور تقاضے بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ یہ لمحہ لمحہ ضروریات کی شکل میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ اس لیے انسان پر اکثر اس کے حیوانی شعور کا غلبہ رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی عقل، ذوق، ارادے اور بدترین حالات میں ضمیر کو بھی اس کے تابع کر دیتا ہے۔

دوسری طرف انسان کا نفسی یا روحانی وجود لاشعوری طور پر یہ جانتا ہے کہ وہ بندہ ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسان کا وجود نہ صرف خدا کی پھونکی ہوئی روح سے تخلیق ہوا ہے بلکہ دنیا میں آنے سے قبل خود انسان کو اس کے رب اور اس کے امتحان سے آگاہ کر دیا گیا تھا، (اعراف 172:7)۔ امتحان کی غرض سے اس واقعے کی براہ راست یاد تو اس کے ذہن سے مٹا دی گئی ہے، لیکن اس یاد کے آثار اس کے اندر اور باہر جگہ جگہ بکھیر دیے گئے ہیں۔ انسان کی انا جس طرح اسے اس کی اپنی ہستی کا شعور دیتی ہے، اسے یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ ایک محتاج محض بندہ ہے، خالق نہیں ہے۔ اس کی پیشانی پر ثبت یہ داغ سجدہ ہی نہیں بلکہ اس کی نفسیات میں موجود تنہائی کا احساس، اس کے حالات میں قدم بقدم پھیلی ہوئی محتاجی اور اس کے اردگرد موجود کائنات میں اپنے خالق کے آثار پڑھ لینے والی عقل سب اسے اپنے مالک کا پتا دیتے ہیں۔

پھر اس کے اندر کا ضمیر جو خدا کا زندہ پیغمبر اور اس کی زندہ عدالت بھی ہے اور اس کے ذوق انسانی کے اندر ابلتا ہوا لامحدود خواہشات کا سمندر جو کبھی جنت کے دیدار سے پھوٹا تھا، اسے صاف بتاتے ہیں کہ اس فانی دنیا میں مکمل سزا و جزا اور مکمل تسکینِ خواہش کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس کے لیے تو ایک جہانِ دیگر چاہیے۔ وہی جہاں روزِ ازل جس کے حسنِ لازوال کی ایک جھلک دیکھ کر انسان اس مہلک امتحان میں بے دریغ کود گیا تھا اور اس راہ کے خطرات کو نظر انداز کرنے کی بنا پر ظالم و جاہل کے خطاب کا مستحق ہوا تھا، (احزاب 72:33)۔

انسانی وجود کے یہ سارے پہلو اسے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ سیدھا اپنی منزل کی سمت بڑھتا چلا جائے۔ مگر اکثر انسان حیوانی شعور سے اتنے مغلوب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی عقل و ارادے کو خواہش اور اپنی خواہش کو اِس عارضی دنیا تک ہی محدود کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی دنیوی راحتوں کے حصول کی جدوجہد میں گزرتی ہے۔ مگر عقل کو مفلوج، ارادے کو پست، جذبات کو کثیف اور ضمیر کو مار کر جو زندگی گزاری جاتی ہے وہ انسان کو ان تمام مسائل سے دوچار کر دیتی ہے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ یعنی اس کی ذات کا روحانی عدم اطمینان، مادی زندگی کی ناکامیوں کا انسانی شخصیت کو مجروح کر دینا اور جذباتی بحران کو پیدا کرنا اور عقلی سوال سے چشم پوشی یا ان کا جواب نہ پا کر عقلی عدم اطمینان کا شکار ہو جانا۔ ان سب پر مستزاد یہ مسئلہ ہے کہ خواہشات اور مفادت کے مارے جذباتی عدم توازن کا شکار انسان زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیتے ہیں اور دیگر انسانوں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔

ایسے میں وحی کی روشنی آسمان سے اترتی ہے۔ وہ عقل و ارادے کو حیوانیت کے تسلط سے آزاد کرنے اور جذبات و خواہشات کو جنت سے متعلق کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ اس کی انا کی بے بسی کے ہر موقع پر خدا کی لامحدود طاقت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے اسے قوت دیتی اور اس کی عقل کے ہر سوال کا جواب دیکر اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ وہ اچھے برے ہر طرح کے حالات میں اسے خدا سے متعلق کر کے اس کی شخصیت کو ٹوٹنے اور بگڑنے سے بچاتی ہے۔

باقی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com